# انیسویں صدی میں اردو تاریخ گوئی

ڈاکٹر انوار احمد*، محمد ابرار (عبدالسلام)**

**Abstract:**
This article deals with the old tradition of "Urdu Tareekh goi in 19th Century". It tells us about the early tradition of this valuable genre. This tradition stated from South India. All the important poets of that age like Nusrati, Taban, Soda, and others contributed in this field. This paper analysis this tradition in 19th century when the poets made this genre more valuable. They used all the artistic beauty to made it are remember able type of poetry.

فارسی میں تاریخ گوئی کی تو ایک قدیم روایت موجود ہے لیکن اردو میں اس روایت کے ابتدائی نقوش جنوبی ہند کی سرزمین میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ بیجاپور میں نصرتی وہ پہلا تاریخ گو شاعر ہے جس نے اردو میں باقاعدہ معنوی اور مکمل تاریخیں کہہ کر اردو میں تاریخ گوئی کی روایت میں ایک اہم مقام حاصل کیا۔ اورنگزیب کی فتح دکن کے بعد جب شمال اور جنوب ایک ہی حکومت کے زیر نگیں آ گئے تو شمالی ہند میں بھی اردو شاعری اپنے ارتقائی مراحل طے کرنے لگی۔ سترھویں صدی عیسوی میں اردو شاعری کے ارتقا کے ساتھ ساتھ اردو میں تاریخ گوئی کے نقوش بھی ابھرنے لگے۔ شمالی ہند میں اٹھارویں صدی عیسوی اردو شاعری کا زریں دور کہلاتا ہے اس عہد میں ہر صنف سخن میں طبع آزمائی ہو رہی تھی لہٰذا تاریخ گوئی کی طرف بھی توجہ دی جانے لگی۔ اب شعرا شاعری کے ساتھ ساتھ تاریخیں کہنے میں بھی مصروف نظر آتے ہیں۔ کوئی واقعہ رونما ہو یا کسی کی ولادت و وفات ہو، کوئی دیوان تکمیل پائے یا کوئی شعری صنف معرض تخلیق میں آئے، شعرا اس کی تاریخیں کہتے نظر آتے ہیں۔ اس عہد کے قابل ذکر تاریخ گو شعرا میں تاباں، سودا، قائم، میر محمد محسن، جعفر علی خان حسرت، محبت خان محبت، فخر الدین ماہر اور مائل وغیرہ شامل ہیں۔ اس صدی میں معنوی تاریخیں کہنے کا رواج ہو چکا تھا لیکن اس میں ابھی وہ وسعت اور رنگا رنگی نہیں آئی تھی جو انیسویں صدی میں دیکھنے میں آتی ہے۔

اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں جن شعرا نے اردو تاریخ گوئی کی روایت کو آگے بڑھایا ان میں مصحفی، انشا، جرات، اور رنگین قابل ذکر شعرا ہیں۔ ان شعرا نے ایک طرف اردو شاعری میں اپنا لوہا

* ڈین فیکلٹی آف آرٹس، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد
** لیکچرار (اُردو) گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، خانیوال

منوایا تو دوسری طرف نادر تاریخیں کہہ کر اس صدی کے اولین تاریخ گو شعرا میں شمار ہوئے۔ اگر چہ ان شعرا نے کثیر تعداد میں اردو تاریخیں تو نہیں کہیں لیکن انیسویں صدی کے وسط میں اردو تاریخیں کہنے والوں کی ایک کثیر تعداد ان کے شاگردوں کی یا ان شاگردوں کے شاگردوں کی نظر آتی ہے۔ اس عہد میں جن اردو تاریخ گو شعرا نے مقبولیت حاصل کی ان میں مومن، مجروح، حاتم علی بیگ مہر، قربان علی بیگ سالک، نساخ، قدر بلگرامی، منیر شکوہ آبادی، ظہور دہلوی، مظفر علی اسیر، منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی، جویا مراد آبادی، ضامن علی جلال، امیر اللہ تسلیم، داغ دہلوی اور امیر مینائی قابل ذکر شعرا ہیں۔

تیرھویں صدی ہجری، انیسوی صدی عیسوی شمالی ہند میں اردو تاریخ گوئی کے عروج کی صدی ہے۔ اس صدی میں ایسے ایسے باکمال تاریخ گو شعرا پیدا ہوئے جنہوں نے اردو میں تاریخ گوئی کو معراج کمال تک پہنچا دیا اور اس فن میں ایسی ایسی گلکاریاں کیں جنھیں دیکھ کر عقل انسانی ورطہء حیرت میں پڑ جاتی ہے۔ چونکہ اس عہد میں اردو زبان اپنے شباب کی حدوں کو چھو چکی تھی اور اس زبان میں موجود تمام امکانات کو بروئے کار لایا جا رہا تھا اس لیے اس عہد میں تاریخ گوئی کے فن نے خوب عروج حاصل کیا۔ گیارھویں صدی ہجری میں زبان اپنے ابتدائی اور ارتقائی مراحل طے کر رہی تھی اس لیے ان ادوار میں تاریخ گوئی کے فن میں ممکنہ امکانات اس طور پر سامنے نہیں آ سکے جس طور پر تیرھویں صدی ہجری میں سامنے آئے۔

تیرھویں صدی ہجری، انیسوی صدی عیسوی اردو زبان و ادب کے عروج کی صدی ہے۔ اس لیے اس عہد میں ایک طرف شاعری میں صنائع بدائع کو نت نئے طریقوں سے برتنے کا رواج عام ہوا تو دوسری طرف تاریخ گوئی کے فن نے مقبولیت بھی حاصل کی۔ شاعری میں صنعتوں کے بے محابا استعمال اور تاریخ گوئی کے محیر العقول نمونوں کی تلاش دہلی کے مقابلے میں لکھنو میں زیادہ دیکھنے میں آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ دہلی میں اردو زبان ابھی اپنے ارتقائی مراحل طے کر رہی تھی بلکہ اس کی وجہ وہ معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی حالات تھے جو دہلی میں موجود نہیں رہے تھے۔ دہلی کے دگرگوں اقتصادی حالات اور زوال آمادہ قدروں کی وجہ سے دہلوی شاعری میں صنعت گری کے امکانات معدوم ہو گئے تھے۔ اس کے مقابلے میں لکھنو میں اقتصادی حالات بھی بہتر تھے اور شعرا کو دربار اور امرا کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ اس وجہ سے لکھنو میں دہلی کی نسبت تاریخ گوئی نے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔

دہلی میں تاریخ گوئی کے عدم فروغ اور لکھنؤ میں فروغ کا ایک سبب دہلی سے ہجرت کرنے والے شعرا بھی رہے ہیں۔ دہلی کے عدم سیاسی استحکام اور معاشی بدحالی کے مارے ہوئے شعرا نے لکھنؤ کو اپنا مسکن بنایا۔ دوسرے

الفاظ میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دہلی کی شعری و ادبی روایت کے معمار اب لکھنؤ کے ادبی ماحول کی صورت گری کرنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی میں مومن اور ظہور دہلوی وغیرہم شعرا کے علاوہ شاید ہی کوئی ایسا شاعر موجود رہا ہو جو اردو تاریخ گوئی کے فن میں کوئی مقام پیدا کر سکا ہو۔ دونوں شعرا میں سے مومن نے بھی چند تاریخیں ہی اردو میں کہی ہیں ۔ان کی کم و بیش تمام تاریخیں فارسی ہی میں موجود ہیں۔ لے دے کے دہلی میں ایک ظہور ہی رہ جاتے ہیں جو اردو تاریخ گوئی کی روایت میں اپنا مقام بنا سکے۔ افسوس سے یہ بات کہنا پڑتی ہے کہ انھیں بھی تاریخ گوئی کی روایت میں نظر انداز کر دیا گیا۔

اس صدی میں اردو تاریخ گوئی کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ شعرا نے شاعری کی تقریباً ہر مروج صنف، ہیئت اور بحر میں تاریخیں کہیں۔ تاریخ گوئی کے نت نئے نمونے سامنے آئے۔ چنانچہ تاریخ گو شعرا کا ایک جم غفیر مجمع شمالی ہند کی سرزمین میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتا اور شمالی ہند کے بڑے ادبی مراکز میں اپنی نادر روزگار گل کاریوں کے نمونے ثبت کرنے میں منہمک نظر آتا ہے۔ شمالی ہند میں اس صدی میں جتنی کثیر تعداد میں اردو تاریخ گو شعرا نظر آتے ہیں اس سے پہلے اتنی بڑی تعداد میں کسی عہد اور کسی علاقے میں دیکھنے میں نہیں آتے۔ اور نہ اس صدی کے بعد ایسی مثال قائم ہوئی۔ اٹھارویں صدی عیسوی تک شعرا بالعموم بادشاہوں، نوابوں اور استاد شعرا کی تاریخ پیدائش و وفات اور اہم واقعات کی تاریخیں کہتے نظر آتے ہیں لیکن تیرھویں صدی ہجری، انیسوی صدی عیسوی میں تاریخ گو شعرا اہم اور غیر اہم، معمولی اور غیر معمولی افراد و واقعات کی تاریخیں بھی کہتے نظر آتے ہیں۔ اس عہد میں شعرا کو تاریخ گوئی کا ایسا چسکا پڑا کہ بات بات پر تاریخیں کہتے اور اپنی مشاقیِ فن کا ثبوت دیتے نظر آتے ہیں۔ گویا شمالی ہند پورے برعظیم میں اردو تاریخ گوئی کی روایت میں گوئے سبقت لے گیا۔

اس عہد میں شمالی ہند میں ایک بڑی تعداد میں لیتھو پریس کے قائم ہونے کی وجہ سے کثیر تعداد میں کتابیں شائع ہونے لگی تھیں۔ کتابوں بالخصوص دواوین کی اشاعت سے پہلے تاریخیں کہہ کر یا کہلوا کر کتاب یا دیوان میں شامل کی جاتیں اور پھر انکی اشاعت عمل میں آتی۔ تاریخ اس عہد میں ایک ایسا لازمہ بن گئی تھی جس کے بغیر کوئی بھی کتاب نامکمل سمجھی جاتی تھی۔ شعرا اپنے دوست احباب کو تصنیف کی خبر دیتے تو ان سے تاریخ کی فرمائش بھی کرتے ۔ بہت سے دوست احباب تو بغیر کہے یہ فرضِ منصبی بجالاتے۔ شاگردوں میں جو شاگرد شعرا تاریخیں کہنے پر قدرت رکھتے وہ اپنے استاد کا حق شاگردی ادا کرنے کے لیے تاریخیں کہتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر استاد شاعر کے دیوان میں سب سے زیادہ تاریخیں ان کے شاگردوں کی ہی ہوتیں۔ خواجہ وزیر وزیر کا دیوان ''دفتر فصاحت'' شائع ہوا تو اس

میں خواجہ وزیر کے جن شاگردوں کی تاریخیں شامل ہیں ان میں خواجہ بادشاہ سفیر، میر امداد حسین نشتر، میر عباس عباس ،شیخ بہادر علی ایجاد، شیخ قادر علی موجد، میرزا نظر علی خطا، مرزا اصغر علی بیگ فقیر، مولوی جلال الدین جلال، لالہ جواہر لعل جوہر، لالہ دھنپت رائے زار، میر محمد حسن حسن، خواجہ اسد قلق، سید محسن علی محسن، مرزا محمد رضا معجز، سید ہادی علی بیخود، میر محمدی سپہر اور میر انعام حسین مجنوں کے علاوہ ان کے شاگردوں اور خواجہ وزیر کے ہم عصر شعرا کی سو سے زائد تاریخیں ان کے دیوان میں شامل ہیں۔

جو شعرا خود تاریخیں کہنے پر قدرت نہیں رکھتے تھے وہ تاریخ گو شعرا سے تاریخیں کہلواتے۔نول کشور پریس سے شائع ہونے والی تقریباً ہر کتاب میں تکمیل یا طباعت کی تاریخ شامل ہوتی۔یہ ادارہ طباعت کی تاریخیں مشہور شعرا سے کہلواتا۔خود ادارہ میں ایسے شعرا موجود تھے جو تاریخ گوئی کے فن پر بھی قدرت رکھتے تھے۔منشی امیر اللہ تسلیم بھی کچھ عرصہ اس ادارے سے وابستہ رہے۔

اس عہد میں تصانیف کی طباعت، تکمیل یا آغاز وغیرہ کی تاریخیں تصنیف میں شامل ہونا ایک لازمہ بن گیا تھا۔بالخصوص دیوان میں تاریخوں کی زیادہ سے زیادہ جمع آوری کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔اس دوڑ میں بہت سے شعرا شامل رہے۔اس عہد میں کسی دیوان میں تاریخوں کی کثرت فخر و مباہات کا باعث بن گیا تھا۔شعرا اپنے دوست احباب، ہم عصر شعرا اور شاگردوں سے تاریخیں کہنے کی فرمائش کرتے اور خود بھی تاریخیں کہتے۔نواب اور امرا اپنے دواوین کی تاریخیں باکمال تاریخ گو شعرا سے کہلواتے۔بہت سے شعرا بذات خود نواب اور امرا کی خوشنودی کے حصول کے لیے تاریخیں کہتے اور نذر گزرانتے یا دور ہونے کی صورت میں نواب کے حضور بھیجتے۔واجد علی شاہ اختر ،نواب یوسف علی خان ناظم ،نواب کلب علی خان، راجہ محمد امیر حسن سحر وغیرہ کے دواوین کی تاریخوں کا ایسا ہی انبار نظر آتا ہے۔

امیر الدولہ سعید الملک سر راجہ امیر حسن خان والیِ ریاست محمود آباد کا کلیات شائع ہوا تو شعرا نے ان کی کلیات کی تکمیل و طباعت کی مختلف صنعتوں میں کہہ کر اتنی تاریخیں بھیجیں کہ وہ بجائے خود ایک دیوان بن گیا۔اس کی تفصیل کلیات سحر میں موجود ان سطور سے لگایا جا سکتا ہے۔

> ''سنتے ہی شعرائے حال و ناظمان فرخ فال فکر تاریخ میں مصروف ہوئے اور ہر ایک نے نظم تاریخ اپنے ذمہ کر لی۔اس قدر تاریخیں جمع اور طبع ہوئیں کہ بجائے خود ایک دیوان کی ضخامت ہوگئی۔غالباً راقم السطور کا دعویٰ بلا دلیل نہ ہوگا کہ عموماً

تمام ملک ہنداور خصوصاً خطہء مردم خیز اودھ میں یہ پہلا دیوان ہے جس میں کل تاریخیں جس کے مصنف مع راقم تقریظ ،۱۵۷،اور قطعات تاریخ ۴۳۸، اور مادہء تاریخ مع فقرات تاریخی ۶۰۸ ہیں جو بلا کسی ترمیم وتصرف کے طبع کی گئی ہیں۔''[۱]

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی عیسوی میں دیوان یا کلیات کی تکمیل یا اشاعت کی تاریخوں کا دیوان،کلیات یا تصنیف میں موجود ہونا کتنا افتخار کا باعث سمجھا جاتا تھا۔کچھ شعرا ایسے بھی تھے جو اس عمل کو ناپسند کرتے تھے چنانچہ انھوں نے ہر رطب و یابس تاریخ کو دیوان میں شامل کر کے خوامخواہ دیوان کی ضخامت بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔اس سلسلے میں منشی ریاض الدین احمد کا بیان نقل کیا جاتا ہے جو انھوں نے اپنے دیوان کے آخر میں شکریہ کے عنوان کے تحت نقل کیا ہے۔

''اکثر گرامی منزلت احباب اور عالی قدر کرم فرماؤں نے اس ناچیز دیوان پر تقریظیں اور تاریخیں لکھ کر اپنا اپنا حسن طبع اور زورِ فکر دکھایا ہے اور خاکسار کو ممنون منت فرمایا ہے۔میں اگرچہ مبالغہ آمیز تعریفوں سے باعتراف ہیچ مدانی و کج مج زبانی شرمسار ہوں تاہم اپنے گرم گستروں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔اگر سب تقریظیں اور تاریخیں اس مقام پر درج کی جائیں تو دیوان کا حجم خوامخواہ بڑھ جائے گا اور ناظرین خردہ بین کے نزدیک بندہ ستایش پسند قرار پائے گا۔اس لیے جملہ عنایت فرماؤں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد صرف چند تاریخیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔اوراس خیال سے کہ تقدیم وتاخیر کسی کے لیے موجب شکایت وملامت نہ ہو تخلصات کے ابتدائی حروف سے ترتیب ملحوظ رکھی ہے۔'' [۲]

منشی صاحب نے جن چند تاریخوں کا انتخاب کیا ہے ان کی تعداد تینتالیس ہے۔یہ تاریخیں پندرہ صفحات پر مشتمل ہیں۔یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ان کے دیوان کے کل صفحات کی تعداد ایک سو تیئیس ہے۔ایک سو تیئیس صفحات کے دیوان میں پندرہ صفحات صرف تاریخوں کو نقل کرنے پر صرف ہوئے ہیں۔اگر تمام تاریخوں اور تقریظوں کو دیوان میں شامل کیا جاتا تو تقریباً نصف صفحات صرف تاریخوں اور تقریظوں پر مشتمل ہوتا۔اسی طرح

۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں احمد حسین مذاق کا مختصر کلیات ''کلیات مذاق'' کے نام سے قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ ۱۰۸ صفحات کے کلیات میں ۱۰۶ غزلیں، ایک مسدس اور دو مختصر مثنویاں ہیں۔ اس کے آخر میں ۶۵ شعرا کی ۸۶ تاریخیں موجود ہیں۔ یہ تاریخیں صرف کلیات کی اشاعت پر کہی گئیں۔

اس عہد میں کتاب کے آخر میں تاریخ کا ہونا ایسا ناگزیر ہو گیا تھا کہ مصنف یا شاعر اس وقت تک کتاب نہیں چھپواتے تھے جب تک اس میں طباعت یا تکمیل کی تاریخ شامل نہ کی جاتی۔ غلام رسول مہر نے غالب کے خطوط کے مجموعے ''عود ہندی'' سے متعلق لکھا ہے کہ ''کتاب (عود ہندی) چھپ گئی لیکن قطعہ تاریخ کے انتظار میں طابع نے آخری صفحہ روک لیا۔ اخبار 'جلوہ طور' مراد آباد کے مہتمم نے آخری صفحہ کے بغیر پچیس جلدیں مول لیں۔ خواجہ غلام غوث بے خبر کو یہ کیفیت معلوم ہوئی تو انھوں نے منشی ممتاز علی خاں کو لکھا کہ قطع تاریخ فرض نہیں اس کے انتظار میں کتاب کی اشاعت نہ روکیے۔''[۳]

اس عہد میں شاعری اس درجہ مروج اور عام ہو گئی تھی کہ اعلیٰ سوسائیٹی میں داخل ہونے اور اس میں عزت و افتخار کا سب سے بڑا وسیلہ شاعری کا نظر آتا ہے۔ اس عہد میں شاعری کی مقبولیت کا اندازہ آزاد کی اس رائے سے لگایا جا سکتا ہے کہ ''گھر گھر شاعری کا چرچا ہے جس امیر اور جس شریف کو دیکھو شعر کی سوچ میں غرق بیٹھا ہے۔''[۴] شاعری ذریعہ عزت تو تھی ہی، نوابین و امرا سے تقرب کا وسیلہ بھی تھی۔ کسی شخص کے لیے شاعر ہونا افتخار کا باعث تھا لیکن تاریخ گو شاعر ہونا اس سے بھی بڑے اعزاز کی بات تھی۔ نظم طباطبائی مالک الدولہ صولت کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''مرحوم کو تاریخ کی بڑی مشق تھی۔ ناسخ کے تتبع میں ان کے تمام شاگردوں نے تاریخ کو صنائع شعریہ میں شمار کیا تھا۔ شاعر کا تاریخ گو ہونا لازم سمجھتے تھے۔ ۱۸۷۲ء میں مٹیا برج سے میں لکھنو آیا تو یہاں دیکھا کہ اکثر شاعروں نے اس کا التزام کر لیا ہے کہ ہر غزل کے مقطع میں تاریخ ضرور ہو۔ انھیں دنوں میں ایک طرح ہوئی تھی 'جواب اچھی طرح ،حساب اچھی طرح' میں اس مشاعرہ میں شریک تھا۔ اپنے ایک مہربان حکیم مرزا فدا احمد صاحب دانش کا تاریخی مصرعہ جو حروف معجمہ میں ہے مجھے اب تک یاد ہے۔ 'مجتمع سب لوگ صحبت انتخاب اچھی طرح''[۵]

مندرجہ بالا بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ اس عہد میں ہر چھوٹا بڑا شاعر تاریخ کہنے میں منہمک ہے اور جو شاعر اس فن پر قدرت نہیں رکھتا تھا اسے اپنی اس کمی کے مداوے کے لیے دوسرے تاریخ گو شاعر کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ غالب جیسے قادرالکلام شاعر کو بھی اس کمی کا احساس شدت سے رہا کہ وہ تاریخ کہنے کی فطری صلاحیت نہیں رکھتے۔ غالب سے تاریخ کہنے کا کہا جاتا تو وہ بڑا سٹپٹاتے۔ اکثر اوقات دوسرے تاریخ گو شعرا سے مادہ تاریخ کہلواتے

اور بقیہ اشعار اس پر جوڑ کر قطعہ تاریخ کہتے ۔اس سلسلہ میں سیاح کو لکھتے ہیں ۔''بھائی تمھاری جان کی قسم اور اپنے ایمان کی قسم ، میں فن تاریخ گوئی اور معما سے بیگانہ محض ہوں ۔اردو زبان میں کوئی تاریخ میری نہ سنی ہوگی ۔فارسی دیوان میں دو چار تاریخیں ہیں ۔ان کا حال یہ ہے کہ مادہ اور کا ہے، اشعار میرے ہیں ۔تم سمجھے کہ میں کہتا ہوں؟ حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا ۔جب کوئی مادہ بناؤں گا حساب درست نہ پاؤں گا ۔ایک دوست ایسے تھے کہ اگر حاجت ہوتی تو مادہ تاریخ ڈھونڈھ دیتے ،موزوں میں کرتا'' [٦]

انیسوی صدی عیسوی میں تاریخ گوئی کا رواج اس قدر بڑھا کہ کتابوں کے نام بھی تاریخی رکھے جانے لگے ۔اردو تصانیف کے تاریخی نام رکھے جانے سے قبل فارسی میں تاریخی نام رکھے جانے کی روایت ملتی ہے ۔اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اردو تصانیف کے نام بھی تاریخی رکھے جانے لگے ۔کتاب نظم کی ہو یا نثر کی ،قواعد کی ہو یا عروض کی ،تذکرہ ہو یا تاریخ ،مثنوی ہو یا واسوخت ،غرض کسی بھی صنف یا موضوع سے تعلق رکھتی ہو کتاب کا نام اکثر اوقات تاریخی رکھا جاتا ۔بعض اوقات سرورق پر تصنیف کے دو نام ہوتے ،ایک اصل اور دوسرا تاریخی ،اور بعض اوقات ایک ہی تصنیف کے کئی نام رکھے جاتے ۔ذیل میں سید محمد علی جویا مرادآبادی کی تصنیف 'سرود غیبی' کے سرورق کی تمام تحریر نقل کی جاتی ہے جس کا ہر فقرہ تاریخی ہے ۔

بعونہ خداوند زمین وزماں ایں نسخہ عجیبہ ۱۸۷۵ء

بوقت محمود وساعت سعیدہ ۱۲۹۲ء

سرود غیبی مسمّٰی بہ خیابان تواریخ

۱۲۹۲ھ ۱۲۹۲ھ

بموجب امداد سرکار والا تبار ۱۲۹۲ھ ،نواب میر علی مراد خان صاحب بہادر دام اللہ ملکہم ۱۸۷۵ء

خلد اللہ ملکہ ودام دولتہ ۱۲۹۲ھ ،نواب دیار خیر پور ۱۲۹۲ھ

مولفہ بندہ سید محمد علی جویا مرادآبادی مقیم ملک جیپور ۱۲۹۲ھ

بہ مطبع منشی نول کشور مقام لکھنو حلہ طبع بپوشید ۱۲۹۲ھ

اس عبارت کے علاوہ سرورق پر چہار جانب دیوان کے چار تاریخی نام ،خزینہء صنعت (۱۲۹۲ھ) ،تواریخ عجیب (۱۲۹۲ھ) ،نگارستان بہجت (۱۲۹۲ھ) اور چمنستان حرفت (۱۲۹۲ھ) بھی لکھے گئے ہیں ۔[٧]

ناسخ کے تینوں دیوان ،'دیوان ناسخ' (۱۲۳۲ھ) 'دفتر پریشان' (۱۲۴۷ھ) ،'دفتر شعر' (۱۲۵۴ھ) ،منیر شکوہ

آبادی کے تینوں دیوان 'منتخب العالم' (۱۲۶۴ھ)، 'تنویرالاشعار' (۱۲۶۹ھ)، 'نظم منیر' (۱۲۹۰ھ)، نواب کلب علی خان والیِ رامپور کے چاروں اردو دیوان، 'نشید خسروانی' (۱۲۹۱ھ)، 'دستنبوئے خاقانی' (۱۲۹۴ھ)، 'درۃ الانتخاب' (۱۲۹۴ھ)، 'توقیع سخن' (۱۲۹۶ھ)، کے نام تاریخی ہیں ۔ اسی طرح تذکروں کے نام بھی تاریخ رکھے گئے ۔ میر قطب الدین باطن کے تذکرے 'نغمہء عندلیب' (۱۲۹۱ھ)، سرور کے تذکرے 'عمدہ منتخبہ' (۱۲۶۱ھ)، قاسم کے تذکرے 'مجموعہ نغز' (۱۲۲۱ھ)، مرزا قادر بخش صابر کے تذکرے 'گلستانِ سخن' (۱۲۷۱ھ)، عبدالغفور خان نساخ کے تذکرے 'سخن شعراء' (۱۲۸۱ھ) اور درگا پرشاد نادر کے تذکرے 'مرات خیالی' (۱۲۹۲ھ) کے نام بھی تاریخی ہیں ۔

مثنویوں کے نام بھی تاریخی رکھے جاتے تھے ۔ مومن کی مثنویوں 'شکایت ستم' (۱۲۳۱ھ)، 'قصہ غم' (۱۲۳۵ھ)، 'قول غمیں' (۱۲۳۶ھ)، 'تف آتشیں' (۱۲۴۱ھ)، 'حنین مغموم' (۱۲۴۴ھ)، اور 'آہ و زاریِ مظلوم' (۱۲۴۶ھ)، واجد علی شاہ کی مثنوی 'حزن اختری' (۱۲۷۶ھ)، منیر شکوہ آبادی کی مثنوی 'معراج المضامین' (۱۲۸۶ھ) کے نام بھی تاریخی ہیں ۔ فنِ انشا، عروض، تاریخ گوئی، سفرنامہ یا کسی اور صنف سے متعلق تصنیف مکمل ہوتی تو ان کے نام بھی تاریخی رکھے جاتے ۔ ریاض سندیلوی کا سفرنامہ 'سرود ریاض' (۱۲۷۷ھ) غالب کے خطوط کا مجموعہ 'مہر غالب' (۱۲۷۸ھ)، منشی حسین علی فرحت کی تاریخی ناموں کی لغت، 'ام التواریخ' (۱۲۸۹ھ)، فن تاریخ گوئی پر جویا مراد آبادی کی تصنیف 'سرود غیبی' (۱۲۹۲ھ) واجد علی شاہ اختر کی عروض پر کتاب 'جوہر عروض' (۱۲۹۰ھ)، اور 'ارشاد خاقانی' (۱۲۶۸ھ)، منشی نول کشور کی لکھنو سے متعلق تاریخ 'تواریخ نادرالعصر' (۱۸۶۳ء)، مرزا اوج لکھنوی کی عروض، فنِ شعر اور تاریخ گوئی سے متعلق تصنیف 'ارمغان' (۱۲۹۲ھ)، واجد علی شاہ اختر کی نظم ونثر کا مجموعہ 'ملک اختر' (۱۲۹۱ھ)، سید محمد عنایت حسین متین سہارنپوری کے سلاموں، مخمسوں اور سراپا وغیرہ پر مشتمل مجموعہ 'شمع تعزیت' (۱۲۹۷ھ) اور مرزا عنایت علی بیگ ماہ کے واسوخت کا مجموعہ 'داغ جگر ماہ' (۱۲۷۴ھ) کے نام بھی تاریخی ہیں ۔

تصانیف کے تاریخی ناموں کے ساتھ ساتھ افراد کے نام بھی تاریخی رکھے جاتے تھے ۔ مظفر علی اسیر کا 'مظفر' (۱۲۲۰ھ)، ظہور دہلوی کا 'ظہور علی' (۱۲۲۱ھ)، غلام مولیٰ قلق کا 'محمد غلام مولیٰ' (۱۲۴۹ھ) غلام حسنین قدر بلگرامی کا 'غلام حسنین' (۱۲۴۹ھ)، مرزا خورشید عالم گورگانی کا 'خورشید عالم' (۱۲۶۱ھ)، سید باقر حسن عرف اچھے صاحب کا 'شہرت حسین' (۱۲۸۳ھ)، ابوالقاسم محمد شمس خلف الرشید نساخ کا 'مظہر الحق' (۱۲۸۴ھ) محمد حسین آزاد کا 'ظہور اقبال' (۱۲۴۵ھ) مرزا سخاوت علی فرزند حاتم علی بیگ مہر کا 'آغا بہرام' (۱۲۵۰ھ)، نظیر حسین شائق اور منشی فضل حسین لکھنوی کا 'نظیر حسن' (۱۲۷۸ھ)، منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی کا 'خورشید علی' (۱۲۳۰ھ)، اور سید اقتدار احمد ساحر

سہسوانی کا 'منظور علی' (۱۳۰۶ھ) تاریخی نام ہے۔[۸]

اس عہد میں شعرا پر تاریخ گوئی کا شوق اس حد تک سوار ہو چکا تھا کہ دن رات اسی عمل میں منہمک رہتے۔ بات بات پر تاریخ کہتے، گویا یہ ایک لت تھی جس کی تشفی کے لیے تاریخیں کہی جاتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں انتہائی غیر اہم اور معمولی معمولی واقعات کی کہی گئی بے شمار تاریخیں نظر آتی ہیں، کسی کی گھڑی گم ہوگئی، کوئی برتن ٹوٹ گیا، کسی کو بخار ہوا، کسی کو مچھر نے کاٹ لیا، کوئی بیمار ہوا، صحت یابی پائی، غسل صحت کیا، کوئی گر پڑا، کسی کے گھر موذی جانور نکلا، کوئی بچہ گم ہوگیا، کسی نے داڑھی رکھ لی یا منڈوا دی، علاج شروع کیا، پرہیز توڑ دیا، کسی کو کوئی کھانا پسند آیا، کوئی مکان بنا، کسی کا عقیقہ ہوا، ختنہ ہوا، بسم اللہ ہوئی، بچہ مکتب میں بٹھایا، کسی کے گھر میلاد ہوا، غرض کوئی بھی واقعہ ہو، شعرا تاریخیں کہتے، یہ ایک ایسی لت تھی جس کی تشفی کے لیے بات بات پر تاریخ کہی جاتی۔ معلیٰ خیر آبادی کے دوست سبحان علی خان کا ورزش کے دوران دانت ٹوٹ گیا تو انھوں نے اس کی فی البدیہہ تاریخ کہی

دست سبحان خاں سے ورزش میں — منہ پہ مگدر جو ان کے چھوٹ گیا
دانت ٹٹتے ہی یوں معلیٰ نے کہا — کہی تاریخ 'دانت ٹوٹ گیا'

۱۲۹۲ھ[۹]

کسی کا طوطا مر گیا تو تاریخ کہی گئی۔

میاں مٹھو جو ذاکر حق تھے — رات دن نام حق رٹا کرتے
چونچ میں داب کے سر کلھیا — کچھ نہ بولے سوائے ٹیں ٹیں کے

[۱۰]

نواب سید احمد علی خاں کا کوئی بٹیر مر گیا جو انھیں بہت پسند تھا اس پر نواب کو بہت دکھ ہوا۔ ان کے درباری شاعر میر ملھو صنعت نے ان کے غم میں شریک ہونے اور اس کی یادگار کے طور پر بٹیر کا تاریخی نوحہ مخمس میں لکھا۔ دو بند نقل کیے جاتے ہیں۔

دل سے نکلتی ہے مرے درد سے اس کے غم میں آہ — کھانچہ سے تن کے ہو خفا ہائے بغیر اشتباہ
ہفتہ کے روز لی وہیں ملک بقا کی اس نے راہ — غرّہ دویمی ربیع اور بوقت چاشت گاہ
دارِ فنا سے کیا کہوں حیف وہ اڑ گیا بٹیر
آنکھوں کے میرے سامنے ہائے وہ اڑ گیا تو پھر — جانے سے اس کے آہ آہ دل پہ قلق ہوا تو پھر

دل کو تشفی دی تو میں اور قلق گھٹا تو پھر　　سال وفات اس کا جب دل سے طلب کیا تو پھر
آئی ندا یہ طالبا آہ بٹیر وا بٹیر

[۱۱]　　۱۲۳۷ھ

بات بات پر تاریخ کہنے کا چسکا شعرا کو ایسا لگ گیا تھا کہ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے، سوتے جاگتے مادہ ءتاریخ ہی سجھائی دیتا، حتیٰ کہ خواب میں بھی انھیں تاریخیں ہی نظر آتیں۔ منیر شکوہ آبادی کو نواب معین الدولہ باقر علی خاں ظفر جنگ کی تاریخ وفات کا مادہ خواب ہی میں ہاتھ لگا۔ تاریخ یہ ہے۔

خلف معتمد الدولہ معین الدولہ　　نام باقر علی و خاں و ظفر جنگ خطاب
صاحب علم و سخن سنج و تخلص ساحر　　نظم تو نظم نہیں نثر کا بھی ان کے جواب
فارسی گویوں میں تھے اہل زباں کی مانند　　قدردان علما مجمع علم و آداب
شاعر و زائر و دیندار و امیر نامی　　حصر اوصاف فضائل کو ہے درکار کتاب
آج دنیا سے گئے سوے عدم وا اسفاہ　　کانپور آتش اندوہ سے ہے سینہ کباب
بخش دے آلِ محمد کے طفیل ان کو خدا　　عیش وعشرت سے رہیں خلد میں تا روحساب
خواب میں ہاتھ لگا مصرعِ تاریخ منیر　　وارد گلشنِ فردوس گرامی نواب

[۱۲]　　۱۲۹۱ھ

خواب میں دوسروں کے مادہ ءتاریخ ہی نظر نہیں آتے۔ اپنے حالات و واقعات سے متعلق مادہ ءتاریخ بھی شعرا تلاش کر لیتے۔ تاسف نے اپنی وفات کی تاریخ خواب ہی میں لوحِ مزار پر کندہ دیکھی تھی۔ تاسف نے یہ تاریخ رقم کرنے سے پہلے یہ عنوان درج کیا پھر تاریخ درج کی۔ ''قطعہ در تاریخ وفاتِ خود کہ مصرعہ مادّہ بعینہٖ بر لوحِ مزارِ خویش کندہ مشاہدہ نمودم در خواب'' [۱۳] احمد حسین سحر نے رنگین کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''از غرائب ایں کہ قبل یک سال از انتقال خود می گفت کہ دریں سال رخت سفر بہ عدم آبادی کشم، چوں سبب پرسید گفت کہ سالہا است کہ بے خواست مصرعہ تاریخ فوت خود بر زبان جاریست کہ از مرگِ من در سالِ آیندہ خبری دہد و آخر ہمچناں اتفاق افتاد'' [۱۴]

شعرا کو تاریخ کہنے کی ایسی لت پڑ گئی تھی کہ تاریخ کہنے کے لیے اہم و غیر اہم واقعات تلاش کیے جاتے۔ دوست، عزیز، احباب میں سے کوئی بیمار ہو جاتا تو پہلے سے اس کی تاریخ وفات کا مادہ ڈھونڈھ لیا جاتا کہ عین وقت پر مادہ ءتاریخ ہاتھ نہ آیا تو پھر کیا کریں گے اور جب مذکورہ شخص کی وفات نہ ہوتی تو کفِ افسوس ملتے کہ ان کا تلاش

کیا ہوا مادہ ءتاریخ ضائع ہو گیا اور ان کی محنت وصول نہ ہو سکی، گویا تاریخ کہنے کے لیے ایسی سان کی ضرورت ہوتی تھی جس پر اپنے اوزاروں کو صیقل کر سکیں، چناچہ تاریخ کہنے کے لیے شعرا اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتے اور جو بھی واقعہ رونما ہوا ہوتا اس کی تاریخ کہتے۔

کسی بڑے شاعر، عزیز، دوست احباب میں سے کسی کے فوت ہونے کی خبر ملتی تو تاریخ کہنے کی سبقت میں اس کی تصدیق بھی نہ کی جاتی اور تاریخ کہہ کر مشہور کر دی جاتی۔ داغ دہلوی آخری عمر میں اکثر بیمار رہا کرتے تھے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ان کے مرنے کی غلط خبر عوام میں پھیل گئی تو شعرا نے بغیر تصدیق کیے ان کی وفات کی تاریخیں کہہ دیں اور اخباروں میں چھپوا دیں۔ ایسا ایک آدھ بار نہیں تین چار بار ہوا۔[۱۵] احسن مارہروی 'انشائے داغ' میں لکھتے ہیں'' مرزا اکثر علیل رہا کرتے تھے اسی سلسلے میں ان کے انتقال کی جھوٹی خبریں شائع ہو جاتی تھیں۔ ۱۸۹۵ء میں بھی ایسی ہی افواہ اڑا دی گئی اور وہ اخباروں میں شائع ہوگئی اور قطعات تاریخ بھی چھپنے لگے۔ جس کی تردید خود مرزا صاحب نے اخباروں میں کی۔ اور بعض شاگردوں کو بھی لکھا''(۱۵) خود داغ نے مشرف یار خان شرف کو ایک خط میں لکھا۔''برس دن تک ایسا بیمار رہا کہ خبر مرگ اخبار میں چھپی۔ مرثیے، تاریخیں لوگوں نے کہیں، تم نے بات بھی نہ پوچھی۔''[۱۶]

تاریخ کہنے میں مزاح کا عنصر بھی شامل رہا۔ اکثر شعرا نے مزاحیہ تاریخیں بھی کہیں۔ کسی طوائف کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی تو محمد نقی مائل کے دوست نے ان سے تاریک کہنے کی فرمائش کی۔ انھوں نے تاریخ کہہ دی ۔آخری شعر یہ ہے

ایسی لڑکی کہے کسے ابّا　　جس کی تاریخ 'دختر قحبا'

۱۳۱۵ھ [۱۷]

امیر اللہ عنایت نے ۱۳۰۳ھ میں اپنا مزاحیہ دیوان'' دیوان عنایت وسفلی'' کے نام سے مرتب کیا۔ اس میں مزاحیہ تاریخیں بھی نقل ہوئی ہیں۔ ایک بوڑھے شخص نے ایک نوجوان لڑکی سے شادی کی تو عنایت نے اس کی بطور مزاح یہ تاریخ کہی

بالغہ سے پیر نابالغ نے عقد اپنا کیا　　عقدہ ءلاینحل جو پیش آیا تو وہ مضطر ہے آج

قاضی جی نے مصرعہ ءتاریخ محفل میں پڑھا　　بڈھا گڈا چھوٹی گڑیا کا بنا شوہر ہے آج

۱۳۰۶ھ　[۱۸]

تلسا نامی طوائف کےبطن سے لالہ ہیمراج کا ایک فرزند پیدا ہوا تو عنایت نے یہ تاریخ کہی

بیٹا ہوا جو تُلسا طوائف کے بطن سے　　کیسا نہال و شاد ہوا ہیمراج ہے
مصرع جنم کے سال کا اے پنڈتو پڑھو　　قلّہ یہ پُھوٹا تلسا کے گملے میں آج ہے

۱۳۰۹ھ [۱۹]

تیرھویں صدی ہجری، انیسویں صدی عیسوی شمالی ہند میں شاعری کے عروج کے ساتھ ساتھ تاریخ گوئی کے عروج کی صدی بھی ہے۔ اس عہد میں ہر اس صنف سخن میں تاریخ کہی گئی جن میں اردو میں شاعری کی جارہی تھی ۔غزل، قصیدہ مرثیہ، سلام، مثنوی، سہرا وغیرہ اور مختلف شعری ہیتوں قطعہ، رباعی، مخمس، مسدس، مربع، مستزاد میں کہی گئی تاریخیں دواوین، تاریخی کتب اور تذکروں وغیرہ میں بکثرت موجود ہیں۔ اس عہد میں تاریخ گوئی کا فن اتنا مقبول ہو چکا تھا کہ اب کوئی صنف سخن اور شعری ہیئت تاریخ سے خالی نظر نہیں آتی۔ شعرا غزل لکھتے تو مقطع تاریخی ہوتا۔ محسن لکھنوی نے حکیم سید ضامن علی شوق خلف میر علی اوسط رشک کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی ہر غزل کا مقطع تاریخی ہوتا ہے [۲۰] یہی بات ناصر نے 'خوش معرکہ زیبا' میں لکھی ہے۔ [۲۱] ناصر نے شوق کی ایک غزل کا تاریخی مقطع بھی نقل کیا ہے۔ وہ مقطع درج ذیل ہے۔

کچھ جھوٹ نہیں مصرع تاریخ یہ شوق　　سچ ہے کہ بجز رشک کے استاد نہیں ہے

۱۲۵۶ھ [۲۲]

امیر علی خاں ہلال کے بارے میں محسن کی رائے ہے کہ ان کا ایک دیوان ہے جس کا ہر مقطع تاریخ ہے۔ محسن نے ان کے ایک سراپا کا ذکر بھی کیا جس کے آغاز کا شعر یہ ہے۔

یہ تاریخ آغاز اشعار کی ہے　　سراپا یہ تصویر دلدار کی ہے

۱۲۶۹ھ [۲۳]

سید اسمٰعیل حسین منیر کے کلیات میں کئی غزلیں ایسی ہیں جن کا مقطع تاریخی ہے۔ شاہ کمال نے اقتدار الدولہ بہادر معروف فتح علی خان کے بارے میں لکھا ہے۔ ''چناں چہ بغم آں یک غزل بطور مرثیہ کہ در مصرع تمام تاریخ وفات برمی آید و یک قطعہء تاریخ کہ ازاں ہم در تمام مصرعِ آخر تاریخ است بر سبیل مذکور بقید قلم می آرد'' [۲۴] پچھلے صفحات میں نظم طباطبائی کا بیان نقل کیا گیا ہے جس میں انھوں نے لکھنؤ میں تاریخ گوئی کی صورت حال پر روشنی ڈالی ہے۔ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ لکھنؤ میں جو مشاعرے ہوتے ان میں پڑھی جانے والی غزلوں کے مقطوں میں

تاریخ ہوتی۔حتیٰ کہ طرحیں بھی تاریخی دی جاتیں۔[۲۵]

یہ چند مثالیں غزل سے متعلق نقل کی گئی ہیں جن سے بقیہ اصناف سخن میں تاریخوں سے متعلق اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ان تاریخی اصناف سخن میں جہاں اس فن کے نادر نمونے اور جدت ادا کی باکمال صنعتیں نظر آتی ہیں وہاں یہ تاریخیں اپنے عہد اور معاشرت کی تاریخ بھی رقم کرتی ہیں۔ان تاریخوں سے ان اصناف کے عہد کا تعین بھی ہو جاتا ہے اور شاعر کے ارتقائی مدارج کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔منیر شکوہ آبادی کی غزلوں میں ان کے حالات بھی تفصیل سے درج ہیں اور ان کے مقطع میں تاریخ کی موجودگی سے ان کے زمانہء تصنیف کا بھی پتہ چلتا ہے۔اس طرح منیر کی حیات اور شاعری کے ارتقائی مدارج اور ان کے عہد کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ذیل میں ان تاریخی اصنافِ سخن کی ایک ایک مثال درج کی جاتی ہے۔

## غزل

ہوتے نہیں ہیں مجھ سے جدا لنگ و بوریا — دیتے ہیں خوب ساتھ مرا، لنگ و بوریا
لپٹا ہے یہ کمر سے، وہ رہتا ہے پائے بوس — بارے ہیں مجھ سے شرطِ وفا ،لنگ و بوریا
دونوں ہیں میرے گوشہء عزلت میں پردہ دار — اک اصل سے بُنے گئے ہیں، لنگ و بوریا
گزرے کئی ہزار کے اسباب و مال سے — اس وقت ہاتھ آئے ہیں، لنگ وبوریا
دشمن ترے کڑھیں مری حالت پہ اے پری — ہونے دے ہیں جو رنج فزا، لنگ و بوریا
ہوتے نہیں ہیں مجھ سے جدا لنگ و بوریا — دیتے ہیں خوب ساتھ مرا، لنگ و بوریا
تاریخ ان کے وصف کی سن لے منیر سے — کافی ہے زادِ راہ خدا، لنگ و بوریا

۱۲۷۴ھ[۲۶]

## قصیدہ

کس کی آمد ہے بہار روح پرور کی طرح — فرش ہیں آنکھیں جو نرگس کی مشجر کی طرح
کس کی آمد ہے کہ ہر موج نسیم رامپور — مشک بیزی کرتی ہے زلف معنبر کی طرح
کس کی آمد ہے کہ اڑ کر ذرہ ہائے خاک ہند — تل بنے رخسارہء گردوں کے اختر کی طرح
کس کی آمد کا یہ مشتاقوں میں چرچا ہے کہ آج — بات بھی کانوں میں پڑتی ہے تو گوہر کی طرح

اس کی آمد ہے کہ جو اٹھا تھا دورے کے لیے — نور برساتا ہوا خورشید خاور کی طرح
اس کی آمد ہے کہ جس کا سایہء بخت بلند — خلق پر چھایا ہوا ہے چرخ اخضر کی طرح
اس کی آمد ہے کہ جس کے ابر فیض مدح سے — جوش زن طبع سخنور ہے سمندر کی طرح
کون وہ حامد علی خان بہادر نامور — وا تھی چشم منتظر جس کے لیے در کی طرح
جس کے جھنڈے کے پھریرے اڑتے ہیں ہر ملک میں — جس کے سکّے بیٹھتے ہیں خاقان و قیصر کی طرح
جس کی تاب حسن سے ہر ہفت ہفت اقلیم ہے — جس کی خاک پا حسیں مَلتے ہیں پوڈر کی طرح
آفریں اس حوصلے پر مرحبا اس عزم پر — کیسی کیسی منزلیں کیں قطع خنجر کی طرح
دہنے بائیں شوکت و اجلال ہمراہ رکاب — آگے آگے دولت و اقبال رہبر کی طرح
کیسے کیسے اونچے اونچے بادشاہوں سے ملے — شان و شوکت میں بڑھے اپنے مقدر کی طرح
اللہ اللہ میہماں جس بزم دعوت میں ہوئے — دور میں آنکھیں رہیں پریوں کی ساغر کی طرح
اس الوالعزمی کی میں نے یہ کہی تاریخ امیر — بارک اللہ سیر عالم کی سکندر کی طرح

[۲۷] ۱۳۱۱ھ

## مثنوی

زہے طبع والاے حضرت نظام — سراپا کلام ان کا معجز نظام
کیا نظم دیوان وہ لاجواب — کہ جس کا ہر اک شعر ہے انتخاب
مگر بے نیازی تھی دل کو کمال — نہ آیا پئے جمع دیواں خیال
وہ گنجینہء گوہرے بے بہا — پریشاں تھا دہر میں جا بجا
مرتب کی صورت ہویدا نہ تھی — کتابی کوئی کل پیدا نہ تھی
کسی کے نہ تھی پاس پوری غزل — پڑھا کرتے تھے سب ادھوری غزل
کہیں کچھ، کہیں کچھ، کہیں کچھ نہ تھا — زمانہ تھا مشتاق بے انتہا
اسی کی ہر اک شخص کو جستجو — اسی کی دلوں میں بھری آرزو
جو قدرت علی خاں والا گہر — ہوے حسرت اہل فن سے خبر

ارادہ مصمم یہ دل میں کیا | کہ غزلیں یہ ہو جائیں سب ایک جا
تجسس تفحص میں باندھی کمر | وہیں پہنچے ،پائی جہاں کچھ خبر
کہیں پا کے ایسا بھی موقع محل | دیا کچھ زر نقد بہر غزل
غرض اس قدر بعد سعی تمام | فراہم کیا یادگار نظام
وہ ترتیب دی عمدہ عنوان سے | کہ ظاہر ہے دلچسپ دیوان سے
کیا حوصلہ پھر یہ بارِ دگر | کہ چھپ کر یہ دیوان ہو مشتہر
پس صرفِ زر اس کو چھپوا دیا | دلی آرزو کو ہویدا کیا
جھکا کر سرِ اندیشہ کا ایک بار | کیا دل میں تسلیم نے کچھ شمار
کہی جلد تاریخ یہ دل پذیر | کہ 'نایاب دیواں چھپا بے نظیر'

۱۳۱۷ھ [۲۸]

سہرا

آسماں پر سے اُسے سن کے یہ کہتا ہے سروش | اس زمیں میں شعرا کہہ گئے اکثر سہرا
ذوق و غالب نے اسی قافیے میں لکھے تھے | گرچہ اول کا کہا جاتا ہے بہتر سہرا
لیکن اس شادی کی تاریخیں اگر ہوں اس میں | فوق لے جائے تمام اہل سخن پر سہرا
پس ملے بکرمی و عیسوی ہر دو سنہ سال | شعر آخر میں بنا جن سے نِکو تر سہرا
دائما شاہ کو شاہانہ ہو فرخ شادی | باصد اقبال خجستہ یہ معطر سہرا

۱۹۵۶بکرمی ۱۸۹۹ء [۲۹]

## گیت

نکالی تان اے اے منہ سے زہرہ نے اور یہ گائی | رہے دولہ سلامت سالیاں دولہن مبارک ہو

۱۱ ۱۱ ۲۱۵ ۴۵ ۵۳۱ ۱۵۲ ۹۵ ۲۶۳ ۱۱=

۱۲۹۰ھ [۳۰]

سلام

سلام ان پر جو پیدا ہوئے محن کے لیے
غریب دشت میں تڑپا کیے وطن کے لیے

اجل بھی روئی شہیدان بے وطن کے لیے
خزاں اداس ہوئی مجرئی چمن کے لیے

غضب ہے چادر تطہیر کے جو مالک ہوں
شہید ہو کے وہ محتاج ہوں کفن کے لیے

شہ اشقیا میں اوڑھائی کسی نے چادر بھی
تنِ حسینؓ تڑپتا رہا کفن کے لیے

اسیر ہو کے کہا شامیو سے عابدؓ نے
ہے ہیں ساعدو بازو مرے رسن کے لیے

دکھا ئی اصغرؓ معصوم نے جو خشک زباں
اجل نے پیار سے بوسے لب ودہن کے لیے

حرم نے رو کے شہیدوں کے حال پر جو کہا
کہ چادریں نہ میسر ہوئیں کفن کے لیے

تو آ کے خلد سے حوروں سے التماس کیا
کہ۔۔۔نور کے حاضر ہیں پیرہن کے لیے

سر حسینؓ اٹھا کر کہا یہ عابدؓ نے
چلے ہیں لے کے یہ سوغات ہم بین کے لیے

سکینہؓ یاد وطن میں تھی جس طرح بے تاب
نہ عندلیب بھی تڑپے گی یوں چمن کے لیے

چھپے جو خاک میں اکبرؓ کہا یہ باقرؓ نے
ہوا تھا چاند مرا بدر اسی گہن کے لیے

دل و جگر ہی نہیں ہے تباہ اسی غم میں
حواس خمسہ پریشاں ہیں پنجتنؓ کے لیے

یہ انقلاب سے عالم کے کھل گیا ہم پر
تڑپ رہا ہے زمانہ شہِ زمنؓ کے لیے

عیاں ہیں سال وفات سے اس پنجتن کے
شرف عجیب یہ حاصل ہے ''یاسمن'' کے لیے

[۳۱]

ریختی

نہیں بازنیں رنج کرتی کسی کا
کیا جب سے یار اور حرمت ہے کھوئی

بلا سے رکھوں شاد دل کو تو اپنے
اگر میں نے کنبے کی عزت ڈبوئی

خصم جب موا لونڈیوں کو بلایا
کہ اس پردے میں رات بھر میں نہ سوئی

ولیکن مجھے کاملوں سے ہے الفت
غمِ ذوق میں رات بھر میں نہ سوئی

لکھی ان کی تاریخ اور یہ ہوا غم
میاں ذوق کو میں بوا آپ روئی

۱۲۷۱ھ [۳۲]

انیسویں صدی عیسوی میں تاریخ گوئی کے لیے ہر ممکنہ صنف ادب میں تاریخ کہنے کی مشق جاری تھی۔ تاریخ گو حضرات اپنی جدت طرازی، ذہانت، مشاقی اور فکر و فراست سے نت نئے طریقوں سے تاریخیں کہہ کر اپنی قادرالکلامی اور مشاقیِ فن کے خوبصورت نمونے ثبت کر رہے تھے۔ یہ نمونے شاعری کی حدود سے نکل کر نثر کی حدوں کو چھو رہے تھے۔ ایسے ہی ایک مشاق تاریخ گو مولوی سیف الحق ادیب کے متعلق لالہ سری رام لکھتے ہیں۔

> ''تاریخ گوئی میں اپنا نظیر ہی نہ رکھتے تھے۔ بات بات میں مادہء تاریخ نکالتے تھے اکثر تاریخی فقرے بولتے تھے۔ ہزاروں قطعات، بیسیوں عرضیاں اور خطوط تاریخی جن کے ہر دل آویزہ فقرہ سے سن و سال نکلتا تھا لکھ ڈالیں چنانچہ حضور نظام خلداللہ ملکہ کے ولی عہد کی پیدائش پر ان کے تاریخی نام اور قصیدے، قطعے اس کثرت اور عمدگی سے لکھے کہ دھوم مچ گئی۔ عجیب ترین قصہ ان کی برجستہ گوئی کا یہ ہے کہ ۱۳۰۲ھ میں ان کے بھائی مولوی انوارالحق میر منشی راجستان نے اپنی بیٹی کی شادی کی۔ وقت وداع سامان جہیز کی فہرست لکھنے کی خدمت انکے سپرد ہوئی۔ چنانچہ فہرست جو بڑی لمبی تھی مع عنوان بقید نام وجنس تمام وکمال تاریخی ہے۔ ہر شے کے ساتھ ایسے موزوں اور مناسب الفاظ ملائے کہ ہر جملہ میں تاریخ موجود ہے۔''[۳۳]

مندرجہ بالا بیان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس عہد میں تاریخ گوئی کے جملہ امکانات کو کس کس طرح برتا جا رہا تھا۔ امرا، نوابین، دوست احباب کو لکھے جانے والے خطوط اور عرضیاں بھی بعض اوقات تاریخی ہوتیں۔ 'اودھ اخبار' لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا ۱۸۷۶ء میں اودھ اخبار کے جتنے بھی اخبار نکلے منشی شیو پرشاد اس خبار کے سرورق کی تمام عبارت اور اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کے تمام عنوانات تاریخی لکھتے رہے۔ (۳۴) ۲۹ نومبر ۱۸۷۶ء کے اخبار میں منشی فداعلی فارغ کی ایک اطلاع شائع ہوئی جس کی ہر عبارت تاریخی تھی۔ اطلاع درج ذیل ہے۔

اطلاع بخدمات جمیع احبا

۱۲۹۳ھ

میں ماہ دسمبر سے جنوری تک سفر میں رہوں گا۔ پھر جس مقام پر قیام کروں گا اطلاع دوں گا۔ اب تا اطلاع آپ عنایات نامے نہ بھیجیں

۱۸۷۶ء ۱۲۹۳ھ ۱۲۸۴فصلی

نیازمند فدا علی فارغ عفی عن

۱۹۳۳سمت

از بلدہء دلچسپ برہانپور چہارم ماہ ذی قعدہ

۱۷۹۸شاکے

ادعاے اظہار کمال

۱۲۸۴فصلی [۳۵]

۲۹ نومبر ۱۸۷۶ء کے اودھ اخبار میں فدا علی فارغ کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے ایک دوست کی سوانح عمری اور وقائع بر ودہ بھی تاریخی لکھی تھی۔(۳۶) غرض اصناف ادب کا کوئی گوشہ، کوئی پہلو تاریخ گوئی کے فن سے خالی نظر نہیں آتا۔ذیل میں منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی کا ایک تاریخی خط درج کیا جارہا ہے۔جس میں انھوں نے اپنے دوست حکیم عبداللہ کو اپنی ناسازیِ طبع کی صورت حال سے آگاہ کیا ہے۔جس کا ہر جملہ تاریخی ہے۔

''ہوالحکیم الحفیظ ہوالباری الماجد۔امید گاہِ حذاقت ،ایمان اخلاق ومحبت، یار موافق حکیم عبداللہ صاحب سلامت،کل مایہء اجل

۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ ستر ہ دست

آئے۔استقلال سے مددگار نے چکر کھائے۔ افواج ضعف کا زور ہے۔وحشت دل کا شور ہے۔انبوہ اندوہ دماغ میں ہے۔

۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ

آئین بد ہوای اپنے باغ میں ہے۔ ولولہ سودا کا خروش ہے۔ نہ آج ادینہ کی یاد نہ جمعرات کا ہوش ہے۔قوت شنیدن ہوائے دیدن سے دور،

۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ

راے تباہ مرگ آب بے قصور،قوت دستبر دموا کب ہم، جان بزمان گرفتار الم، با یکدیگر حیات وممات جدال و جنگ۔عرصہ نشاط حاصل اسباب تنگ،

۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ

خوشی وانبساط مقصود ہے۔ گرسنگی کے بدلے تشنگی موجود ہے۔ تشنگی وہ کہ آب بحر سے نہ بجھے۔ وجع وہ کہ مرے پر بھی دو چار برس رہے۔

۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ

بندہ پرور گیارہ مسہل تو ہو چکے، اور ہم طاقت ومجال معرکہ آزما کھو چکے۔ انجام فصد پیرانہ سالی میں قہر ایزد دادار ہے،

۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ

کہ پیش چشم جویائے رنگ سپید وسیاہ لیل ونہار ہے۔ بہر تقدیر آج کچھ تجویز ہو، کہ اعطاف مرگ وکجروی زندگی کی تمیز ہو۔

۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ

بلب آمد سن غم بیز از دل شدا ز اسہال شان ہال یکدست

۱۲۹۰ھ ۱۲۹۰ھ

نامہ نیاز تسلیم جانگداز مرقوم دوم جون

۱۲۹۰ھ [۳۷]

تسلیم کا مندرجہ بالا خط کئی لحاظ سے خوبیوں کا حامل ہے۔ پہلی خوبی یہ ہے کہ یہ تاریخی خط ہے۔ اس کا ہر جملہ تاریخی ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ ہر فقرہ باوزن ہے اور ہر دو فقرے مل کر ایک مطلع کی صورت اختیار کر گئے ہیں جن میں قافیہ بھی موجود ہے اور ردیف بھی۔ مزید یہ کہ تسلیم نے اپنا مدعا بھی بحسن خوبی مکتوب الیہ تک پہنچا دیا ہے۔ خط میں آغاز بھی ہے اور انجام بھی۔ القاب وآداب کا خیال بھی رکھا ہے اور اختتام میں رخصت بھی خوبصورت انداز سے ہوئے ہیں۔ اپنی حالت زار کا بیان شعر میں بھی کر دیا ہے اور آخر میں خط کی تاریخ بھی درج کر دی ہے۔

کتاب کا اختتامیہ بھی تاریخ لکھا جاتا۔ نواب محمد احمد علی خان رونق کا دیوان 'رونق سخن' ۱۸۹۰ء میں شائع ہوا تو اس کا اختتامیہ بھی تاریخی لکھا گیا۔ اختتامیہ درج ذیل ہے۔

''شکر خدائے دو عالم کا، کہ دیوان مسمّٰی رونق سخن، باہتمام میر معظم صاحب، در مطبع نامی فاروقی دہلی طبع شد۔ حق تصنیف کلام محفوظ

۱۳۰۷ھ ۱۳۰۷ھ ۱۸۹۰ء ۱۳۰۷ھ ۱۸۹۰ء

ہوا۔[۳۸]

اس عہد میں مختلف اصناف سخن اور شعری ہیئتوں ہی میں تاریخیں نہیں کہی گئیں بلکہ شاعری میں نئی نئی صنعتوں میں تاریخ کہہ کر اپنی مشاقِ فن کا ثبوت بھی دیا گیا۔ایسی ایسی صنعتوں میں تاریخ کہی گئیں جن کی مثالیں اس عہد سے قبل اردو اور فارسی میں کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔اگر چہ فارسی شاعری میں شعرا نے حیرت انگیز جدت طرازیوں کے ساتھ نئی نئی صنعتوں میں تاریخیں کہی ہیں لیکن اردو تاریخ گو شعرا فارسی تاریخ گو شعرا سے ایک قدم آگے بڑھ گئے۔ایسی ایسی محیر العقول تاریخیں کہی گئیں جنھیں دیکھ کر عقل انسانی انگشت بدنداں رہ جاتی ہے اور بے اختیار منہ سے کلمہء تحسین نکل جاتا ہے۔ایک ایک تاریخ سے سینکڑوں نہیں ہزاروں تاریخیں نکالی گئیں۔

صنعت نادر میں تاریخ کہنا انتہائی مشکل کام ہے۔مومن نے اس میں ایک اور جویا مراد آبادی نے پچیس تاریخیں کہیں لیکن رام پرشاد ظاہر نے دیوان ظاہر میں اس صنعت میں دوسو سے زائد تاریخیں کہہ کر اس فن میں اپنی مشاقِ طبع اور قادر الکلامی کا ثبوت فراہم کیا۔صنعت نادر یہ ہے کہ حروف ابجد کے ہر حرف سے جو عدد شمار کیے جاتے ہیں ان کے اعداد لیے جائیں گے۔مثلاً 'ا' کے عدد یک 'ب' کے دو 'ج' کے سہ اور 'د' کے چہار عدد لیے جائیں گے۔۔لہٰذا صنعت نادر میں 'ا' کے عدد ایک کی بجائے یک سے حاصل ہونے والے عدد، ۳۰، ب کے دو کے عدد، ۱۰، ج کے سہ کے عدد، ۶۵، اور د کے چہار کے عدد، ۲۰۹، لیے جائیں گے۔ظاہر نے اپنے اس رسالے کا نام بھی صنعت نادر میں 'چمن تاریخ' (۱۳۰۴ھ) رکھا ہے۔صنعت نادر میں 'چمن تاریخ' کے اعداد اس طرح حاصل کیے جائیں گے۔

| چ | م | ن | ت | ا | ر | ی | خ |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| سہ | چہل | پنجاہ | چہارصد | یک | دوصد | دو | شش صد |
| ۶۵ | ۳۸ | ۶۱ | ۳۰۳ | ۳۰ | ۱۰۴ | ۹ | ۶۹۴ = ۱۳۰۴ھ |

دلچسپ بات یہ ہے کہ رام پرشاد ظاہر نے سمت، عیسوی، ہجری، فصلی، وغیرہ سنوں میں تاریخیں کہہ کر اور صنعت در صنعت کا استعمال کر کے اس فن پر اپنی قادر الکلامی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔اس عہد میں کثیر تعداد میں صنعتوں میں تاریخیں کہی گئیں جن میں صنعت مرصع، صنعت منقوط، صنعت مقلوب، صنعت جمع، صنعت تفریق، صنعت تنصیف، صنعت تضاعف، صنعت حساب، صنعت بلیغ، صنعت عجیب، صنعت کمال، صنعت توشیح، صنعت زبر و بینات، صنعت مربع، صنعت تحریک، صنعت مراتب، صنعت معکوس، صنعت مکتوبی، صنعت تسکین، صنعت واسع شفتین، صنعت سروری وغیرہ اہم صنعتیں ہیں۔ذیل میں صنعت نادر میں کہی گئی ایک تاریخ نقل کی جاتی ہے۔اس میں خوبی یہ

ہے کہ شاعر نے ہر حرف کو تاریخ شمار نہیں کیا بلکہ ہر لفظ کو بے سر و پا کر کے درمیان کے حروف سے صنعت نادر میں تاریخ نکالی ہے۔ تاریخ وفات مرزا احسان علی بیگ

جو کہ نامی نامور تھے اہل دل والا تبار عالی ہمم — چل دیے صد حیف اس دارِ فنا سے جانب ملک عدم
ہو گئے بے سر و پا ظاہر نے یہ لکھا بصنع نادرات — صبر و داد و حلم و عقل و ہم فاجاہ و حشم شرم و کرم

۱۳۱۱ھ [۳۹]

نئی نئی صنعتوں میں تاریخیں کہنے کے ساتھ ساتھ شعرا نے مروجہ اور غیر مروجہ سنین میں بھی تاریخیں کہیں۔ ان سنین میں ہجری، عیسوی، فصلی، سمبت، مہدوی، بنگلہ، وغیرہ سنین کی تاریخیں قابل ذکر ہیں۔ ان سنین میں سے اکثر اوقات ہجری اور عیسوی سنہ میں تاریخیں کہی جاتیں۔ بعض اوقات ایک ہی واقعہ کی تاریخ سنہ ہجری اور سنہ عیسوی میں کہی جاتی۔ دونوں سنین کے علاوہ بھی سنین میں تاریخیں کہی جاتی رہیں لیکن بہت کم۔ انیسویں صدی میں اکثر تاریخیں سنہ ہجری میں کہی گئیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کے باعث سنہ عیسوی رائج ہوا تو شعرا نے اس میں بھی تاریخیں کہیں۔ سنہ ہجری کے بعد سب سے زیادہ تاریخیں سنہ عیسوی ہی میں کہی گئیں۔ ان دو سنین کے علاوہ فصلی، سمبت، بنگلہ، اور مہدوی وغیرہ میں بھی تاریخیں کہی جاتی تھیں۔ ذیل میں مہتاب الدولہ بہادر درخشاں کی کہی ہوئی 'بادشاہ نامہ' مصنفہ صدر محل کی ایک تاریخ نقل کی جاتی ہے جس میں شاعر نے ان تمام سنین سے تاریخی مادے تلاش کیے ہیں۔

مژدہ آیا یہہ کل درخشاں — لے چھپ چکا سب کلامِ ذی شاں
۱۲۸۸ھ — ۱۲۸۸ھ

سو شطِّ سخن میں طبع ڈوبی — ہیں صدر محل بھی بدرِ خوبی
۱۲۸۸ھ — ۱۲۷۸فصلی

وارفتہ شویِ رشکِ قیصر — بابوئے وفا شعارِ اختر
۱۹۲۸سمت — ۱۹۲۸سمت

دارا دل خسروِ سخنداں — کی قوت ثانی سلیماں
۱۸۷۱ء — ۱۲۸۸ھ

جم مرتبہ و جناب صولت — جانِ عالم بقائے عشرت

۱۲۷۸بنگلہ
یہہ بات کسی پہ کچھ ہے مخفی
۱۲۸۸ھ
مضمون دیوان میں ہیں ہمہ نو
۱۲۷۸بنگلہ
یوں بادہء عشق ِ شہ سے مدہوش
۱۲۷۸فصلی
فرقت نے بھی بس کیا یہہ بے ہوش
۱۲۸۸ھ
دیوان میں جو وصف ِ شوقِ وصلت
۱۲۸۸ھ
تھی فکرِ سنینِ طبع دو شب
۱۲۷۸ولایتی
وا آج ہے کیا ہی بابِ تاریخ
۱۲۸۸ھ
مشہور اک زرفشاں ہے خامہ
۱۸۷۱ء
پیدا یہہ خلاصہ ہے درخشاں
۱۲۸۸ھ

۱۲۷۸ولایتی
ہے صدر محل سے نامِ مخفی
۱۲۷۸فصلی
یہہ ایک کمالِ فکرِ مہ ضو
۱۲۸۸ھ
ساقی تو ہے یاد جان فراموش
۱۲۸۸ھ
راحت وہ گئی فراموش
۱۲۸۸ھ
سمجھو یہہ ہے دفترِ محبت
۱۲۷۸فصلی
ہر سو قصدا تلاش مطلب
۱۲۷۸بنگلہ
ہر مصرعِ نو جناب تاریخ
۱۹۴۸سمبت
کیا خوب محک ہے عشقنامہ
۱۲۸۸ھ
ہے صدر محل نثارِ سلطاں
۱۲۸۸ھ [۴۰]

انیسوی صدی اردو شعر و ادب کے عروج کی صدی ہے اس صدی میں اردو نثر اور شاعری میں جملہ تخلیقی امکانات کو بھرپور طریقوں سے بروئے کار لایا گیا۔اردو شاعری کے ساتھ ساتھ اردو تاریخ گوئی بھی اپنے تمان امکا نات کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔شمالی ہند وہ سرزمین ہے جہاں باکمال تاریخ گو شعرا پیدا ہوئے۔جنھوں نے اردو تاریخ گوئی کو بام عروج تک پہنچا دیا اور اردو میں ایسے ایسے نادر تاریخی نمونے تخلیق ہوئے جس کی مثال اس سے پہلے یا بعد

میں دیکھنے میں نہیں آتی۔

۱۸۵۷ء کے بعد کچھ عرصہ رام پور اور حیدرآباد دکن کی ریاستوں کی صورت میں اس فن کو عارضی بیساکھیاں نصیب ہوئیں لیکن بیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے رہے سہے باقی ماندہ سہارے بھی معدوم ہوتے چلے گئے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزی اقتدار کے دوبارہ تسلط، مغل اشرافیہ کے باقیات کے خاتمے، معاشی، اور معاشرتی حالات کے انقلاب، جدید حکومت کے قیام کے زیر اثر رونما ہونے والی تبدیلیوں اور نئے تصورات کی وجہ سے جو نیا سماج وجود میں آرہا تھا اس سماج کا ماحول نہ اس فن کے لیے سازگار تھا اور نہ یہ معاشرہ اس کے وجود کی بقا کی ضمانت فراہم کرنے پر تیار تھا۔ چنانچہ یہ فن آہستہ آہستہ اپنے زوال کی طرف گامزن ہوا۔

قصیدے اور مثنوی کی طرح اس فن کو تیزی سے زوال کیوں نہ آیا؟ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ قصیدہ اور مثنوی دونوں صرف خواص تک محدود تھے لیکن تاریخ گوئی کی جڑیں انیسویں صدی میں خواص سے عوام تک پھیل چکی تھیں۔ درباروں کے ختم ہونے کے بعد خواص کے لیے تو اس میں کوئی کشش باقی نہ رہی تھی لیکن عوام کی دلچسپی کا باعث صلے کی تمنا اور اقتدار کی خواہش نہیں تھی۔ اس لیے عوامی مقبولیت کم ہونے میں ذرا دیر لگی اور اسے فوری طور پر زوال کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ سرپرستی کے فقدان اور حالات کی تبدیلیوں کے باعث تاریخ گوئی کی مقبولیت کا گراف نیچے کی طرف آنا شروع ہوا۔ بیسویں صدی کے اختتام تک صورت حال یہ ہوگئی کہ اس فن کے اسرار و رموز سے واقف شعرا ڈھونڈھے نہیں ملتے۔ اور اگر چند لوگ مل بھی جائیں تو ان میں وہ صلاحیتیں مفقود ہیں جو انیسویں صدی کے شعرا کا خاصہ تھیں۔ نئی نسل کے شعرا میں شاید ہی دو چار شعرا ایسے ہوں جو اس فن سے واقف ہوں اور تاریخ کہنے کی فطری صلاحیت رکھتے ہوں۔

انیسویں صدی کی روایات اور تہذیبی قرینوں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اردو کے محققین اور ناقدین نے تاریخ گوئی کے تہذیبی قرینے کی بازیافت کی طرف بہت کم توجہ دی ہے۔ اس امر کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ اردو تحقیق اور تنقید کو اب اپنی اس بے اعتنائی کا کفارہ ادا کرنا لازم ہے۔

## حواشی وحوالہ جات

۱۔ ''کلیات سحر''، راجہ محمد امیر حسن خان سحر، باہتمام محمد مرزا محمود آباد ۱۳۲۰ھ۔کلیات سحر ۷۰۸۔۷۰۷،''کلیات سحر'' ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا۔اس طرح اس بیان کو بیسویں صدی کا یا اس کے آغاز سے متعلق ہونا چاہیے لیکن یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ''کلیات سحر'' میں موجود ''قصائد سحر''، ''مطالع سحر''، ''دیوان سحر'' پر ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۹۔۱۸۹۸ء مرقوم ہے۔اور ''کلیات سحر'' پر ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء۔شعرا نے تاریخیں چونکہ بیسویں صدی کے آغاز میں کہی ہیں۔لہٰذا انھیں انیسویں صدی کے بیان میں شمار کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں

۲۔ ''دیوان فدا اسم تاریخی پری خانہ ءمحبت'': منشی ریاض الدین احمد فدا، افضل المطابع دہلی، ۱۸۴۷ء ص ۱۲۳

۳۔ ''غالب'' از غلام رسول مہر، شیخ مبارک علی بک سیلرز، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۴۰۳

۴۔ ''آب حیات'' از محمد حسین آزاد، مرتبہ ابرار عبدالسلام، شعبہء اردو بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۶ء، ص ۵۳

۵۔ ''خاتمہ تذکرہ مالک الدولہ صولت'' مشمولہ ''ادیب''، الہ آباد ۱۹۱۳ء۔۱۹۱۰ء، پہلی جلد خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ ۱۹۸۰ء ص ۴۷۔۴۶

۶۔ غالب از غلام رسول مہر ص ۳۶۰

۷۔ دیکھیے: ''سرود غیبی''، سرورق، خیابان تواریخ کے نیچے ۱۲۹۲ھ مرقوم ہے لیکن اس سے ۱۸۸۱ عدد برآمد ہوتے ہیں۔دراصل جویا نے یہ تاریخی نام خیابان تاریخ رکھا ہوگا اس سے ۱۸۷۵ء برآمد ہوتے ہیں اس کا ثبوت ''نواب میر علی مراد خان صاحب بہادر دام اللہ ملکہم'' کی تاریخی عبارت سے بھی ملتا ہے کیونکہ اس سے ۱۸۷۵ء برآمد ہوتے ہیں جو ۱۲۹۲ھ کے مطابق ہے۔یہ غلطی جویا سے نہیں ہوئی ہوگی بلکہ کاتب سے ہوئی ہوگی۔

۸۔ دیکھیے: ''لکھنؤ کے چند نامور شعرا'': ڈاکٹر سید سلیمان حسین، سرفراز قومی پریس لکھنؤ، ۱۹۷۳ء ص ۱۷۵ (i) ''دیوان ظہور'': ظہور دہلوی، مطبع محبّ کشور ہند، میرٹھ، ۱۳۰۰ھ (ii) ''قلق میرٹھی، حیات اور کارنامے'': ڈاکٹر جلال انجم، فیضی پبلی کیشنز بلی ماراں، دہلی، ۱۹۸۷ء ص ۱۸ (iii) ''کلیات قدر'': غلام حسنین قدر بلگرامی، مطبع مفید عام، آگرہ، ص ۲ (iv) ''خمخانہء جاوید'': لالہ سری رام جلد پنجم، مخزن پریس، دہلی ۱۹۴۰ء، ص ۲۰۰ (v) ایضاً ص ۳۱ (vi) ''آب حیات'' ص ۱، ''مکاتبہ متفرقہ'' ص ۱۴، (vii) ''خمخانہء جاوید'' جلد دوم، لالہ سری رام جلد دوم، رائے گلاب سنگھ پریس لاہور، ۱۹۱۱ء، ص ۱۶۴، (viii) ''تحقیق''، شمارہ ۱۴۔۱۳ ص ۴۹۴، (ix) ''خمخانہء جاوید'': جلد دوم ص ۱۷

۹۔ ''ریاض معلیٰ'' حافظ محمد مظفر الدین معلیٰ صدیقی حیدر آبادی، عماد پریس چھتہ بازار حیدر آباد، ۱۳۴۰ھ ص ۸۲

۱۰۔ ''چمن بے نظیر''، مرتبہ محمد احمد علی مطبع مجیدی کانپور، ۱۳۲۸ھ ص ۳۵۳

۱۱۔ ''تذکرہ کاملان رام پور'': حافظ احمد علی شوق، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۱۹۸۶ء ص ۴۰۶۔۴۰۵

۱۲۔ ''کلیات منیر'': سید اسمٰعیل حسین منیر، مطبع ثمرً ہند لکھنؤ، ۱۸۷۹ء ص ۵۳۷

۱۳۔ ''دیوان صدغزل'': حسین علی تاسف مرتبہ ڈاکٹر شبیہہ الحسن نونہروی، نظامی پریس کانپور، ۱۹۷۳ء ص ۲۳۹
۱۴۔ ''بہار بے خزاں'': احمد حسین سحر مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، سلسلہ مطبوعات علمی مجلس، دہلی (۱۷) ۱۹۶۸ء، ص ۵۶
۱۵۔ دیکھیے: ''خمخانہ ءجاوید'': لالہ سری رام، دلی پرنٹنگ پریس دلی، ۱۹۱۷ء جلد سوم ص ۱۱۳
۱۶۔ ''انشائے داغ'': داغ دہلوی، مرتبہ سید علی احسن مارہری، انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی ۱۹۴۱ء، ص ۸۹
۱۷۔ ''تذکرہ شعرائے جے پور'': احترام الدین شاغل، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، ۱۹۵۸ء ص ۴۰۷
۱۸۔ ''دیوان عنایت وسفلی'': امیر اللہ خان عنایت، انوار المطابع لکھنؤ، ۱۳۱۶ھ ص ۱۰۳
۱۹۔ ایضاً
۲۰۔ ''سراپا سخن'': محسن علی محسن، مطبع منشی نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۵ء ص ۶۰
۲۱۔ ''خوش معرکہ زیبا'': سعادت خان ناصر مرتبہ مشفق خواجہ، مجلس ترقی ادب لاہور، جلد دوم ص ۳۲۰
۲۲۔ ایضاً۔ مذکورہ مادہ تاریخ سے ۶۳+۱۵+۲۵+۵۲۰+۳۰+۴۶۶+۱۱۵+۱۵=۱۲۶۱ھ۔ مادہ ءتاریخ میں اگر 'کے' کو 'کہ' پڑھیں تو پانچ عدد کی کم ہو جاتے ہیں۔
۲۳۔ ''سراپا سخن''، ص ۳۳۰
۲۴۔ ''مجمع الانتخاب'': شاہ کمال مشمولہ ''تین تذکرے''، مرتبہ نثار احمد فاروقی، مکتبہ برہان اردو بازار، دلی، ۱۹۶۸ء، ص ۶۳
۲۵۔ ''تذکرہ خاتمہ مالک الدولہ صولت'' از نظم طباطبائی مشمولہ ''ادیب'' الہ آباد، ۱۹۱۳ء۔۱۹۱۰ء، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ص ۴۷۔۴۶
۲۶۔ ''کلیات منیر'' ص ۲۰۷
۲۷۔ ''امیر مینائی''، ممتاز علی آہ، ادبی پریس لکھنؤ ۱۹۴۱ء ص ۱۱۹۔۱۱۸
۲۸۔ ''کلیات نظام'': نظام شاہ نظام مرتبہ کلب علی خان فائق مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۵۲۷
۲۹۔ ''ایک تاریخی تاریخ گو'': خلیفہ سید محمد حسن متین: آغا محمد باقر مشمولہ ''ادبی دنیا''، لاہور جنوری ۱۹۶۲ء ص ۱۷۹
۳۰۔ ''واجد علی شاہ کی ادبی اور ثقافتی خدمات''، ص کوکب قدر سجاد میرزا، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۲۹۳
۳۱۔ ''امیر مینائی''، ص ۲۹۷۔۲۹۶۔ مندرجہ بالا سلام میں سنہ وفات حضرت محمد ﷺ اور حضرت فاطمہؓ ۱۱ھ، لفظ 'یا' سے سنہ وفات حضرت علیؓ ۴۰ھ حرف 'م' سے، سنہ وفات حضرت امام حسنؓ ۵۰ھ حرف 'ن' سے سنہ وفات حضرت امام حسینؓ ۶۰ھ حرف 'س' سے حاصل ہوتا ہے۔ جب کہ مادہ ءتاریخ ''یا سمن'' ہے۔
۳۲۔ ''تاریخ ریختی مع دیوان جان صاحب'': میر یار علی جان مرتبہ سید محمد مبین مطبع انوار محمدی الہ آباد ص ۵۶
۳۳۔ ''خمخانہ ءجاوید'': لالہ سری رام، ہمدرد پریس، لاہور، ۱۹۰۸ء، جلد اول ص ۲۵۴
۳۴۔ دیکھیے: ''اودھ اخبار'' لکھنؤ سال ۱۸۷۶ء کی مکمل فائل

۳۵۔ ''اودھ اخبار''، لکھنؤ نومبر ۱۸۷۶ء ص ۲۱۰۶
۳۶۔ ایضاً
۳۷۔ ''ملخص تسلیم''، منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی، مطبع مطلع العلوم واخبار نیر اعظم مرادآباد، ۱۸۹۶ء ص ۱۰۸۔۱۰۷
۳۸۔ ''رونق سخن''، نواب احمد علی خان رونق، مطبع فاروقی دہلی، ۱۳۰۷ھ ص ۳۷۸
۳۹۔ ''دیوان ظاہر''، منشی رام پرشاد ظاہر، افضل المطابع دہلی۔ ۱۹۰۱ء، ص ۱۲۳ ص ۹۶
۴۰۔ ''بادشاہ نامہ''، نواب صدر محل، مطبع سلطانی کلکتہ ۱۲۸۸ھ ص ۱۹۵۔۱۹۴